دلم بسبحۂ و سجادۂ و ردا لرزد — کہ دزد و مرحلہ بیدار و پارسا خفتست

براہِ حقیقتِ من ہر کہ بنگرد داند — کہ میرِ قافلہ در کاروان سر خفتست

پہلا شعر محض رندانہ ہے؛ اور زبان کی گرمی اور شوخی کے سوا اور کوئی معنوی لطافت نہیں رکھتا؛ اُسکے بعد کے تینوں شعر ہم ستے کی ردیف کے انتخابی اشعار میں مع ہر ایک کی شرح کے لکھ آئے ہیں۔ اِنمیں سے پہلا شعر ہمارے نزدیک مرزا کی تمام غزل میں بیت الغزل ہے۔ اور پچھلے دونو شعر بھی نظیری کے غزل کے عام اشعار سے کسی طرح رتبے میں کم نہیں ہیں۔ پس اگر نظیری کا بہت ادب کیا جائے تو ہم اِس سے آگے نہیں بڑھ سکتے کہ دونو غزلوں کو مساوی درجے میں رکھیں۔ ورنہ انصاف یہ ہے کہ ہیاتِ مجموعی کے لحاظ سے مرزا کی غزل نظیری کی غزل سے یقیناً بڑھ گئی ہے۔ لیکن ایک آدھ غزل میں نظیری سے سبقت لیجانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کی غزل کو مطلقاً نظیری کی غزل پر ترجیح دیجائے۔ نظیری وہ شخص ہے جسکی نسبت مرزا صائب کہتے ہیں۔

"صائب چہ محال ست شوی ہمچو نظیری — عرفی بہ نظیری نرسانید سخن را"

اور مرزا جلال اسیر کہتے ہیں۔

ہمچیشمی نظیری حدِ بشر نباشد

اور شیخ ابو الفضل آئین اکبری میں اُسکی نسبت لکھتے ہیں "دورے از نزہتگاہِ معنی بر دی کشودہ اند" پس ہماری غرض مذکورہ بالا غزلوں کے مقابلہ کرنے سے صرف اس قدر تھی کہ مرزا نے غزل میں نظیری کے تتبع کو جس درجے تک پہنچایا تھا اُس سے لوگ اچھی طرح مطلع ہو جائیں۔ ورنہ اس غزل کی ہو

اور جس قدر غزلیں مرزا نے نظیری کی غزلوں پر لکھی ہیں اُن میں شاید ہی کوئی غزل ایسی ہوگی جسمیں نظیری کی غزل کا پلہ مرزا کی غزل سے غالب نہو۔ کیونکہ اکثر پچھلے شعرا اگلوں کی اُنھیں غزلوں پر طبع آزمائی کرتے ہیں جو اُنکے سارے دیوان میں چیدہ و برگزیدہ اور منتخب ہوتی ہیں۔ پس ایسی چیزوں میں اگلوں سے پچھلوں کا سبقت لیجانا کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔

اب ہم مرزا کی ایک غزل کا موازنہ ظہوری کی غزل کے ساتھ کرتے ہیں کہ یہ دونو غزلیں شیخ سعدی کی اس غزل پر لکھی گئی ہیں

"شبِ فراق چہ داند کہ تا سحر چند ست — مگر کسیکہ بزندانِ عشق دربند ست"

اگرچہ مرزا نے ظہوری کی غزلوں پر بہت کم غزلیں لکھی ہیں۔ مگر چونکہ وہ اپنے تئیں ظہوری کا متتبع ظاہر کرتے ہیں اس لئے اُسکی ایک غزل کے ساتھ بھی مرزا کی غزل کا موازنہ کرنا ضرور تھا۔ ظہوری کا دیوان جو ہمارے پاس موجود ہے اُسمیں - یا تو کاتبوں کی تصحیف سے، اور یا خود ظہوری کی پیچیدہ بیانی کے سبب - اکثر اشعار کے معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ بہت مشکل سے صرف ایک غزل ایسی نکلی ہے جسکے ہر ایک شعر کے کچھ نہ کچھ معنی اپنی سمجھ کے موافق لگا لیئے گئے ہیں؛ اور اُسکے تمام اشعار کا مقابلہ بعض اصحاب کی معرفت دوسرے صحیح نسخہ سے بھی کر لیا گیا ہے۔ اس لئے وہی غزل موازنے کے لئے انتخاب کی گئی ہے۔ اور چونکہ وہ شیخ کی غزل پر لکھی گئی ہے اس واسطے خیال کیا گیا ہے کہ ظہوری نے اُسمیں اپنی پوری طاقت صرف کی ہوگی۔ ایک اور وجہ اس غزل کی تخصیص کی یہ ہے کہ مرزا نے اپنی تمام غزل میں ایک شعر کے سوا تمام اشعار میں وہی قافیے باندھے ہیں جو ظہوری کے ہاں بندھے ہوئے تھے۔ اور نیز دونو غزلیں ابیات کی تعداد کے لحاظ سے بھی برابر یعنی

یعنی وِش دِش بیت کی ہیں۔

غالب	ظہوری
چو صبح من زسیاہی شام مانندست	بعشق قابلِ دیوانگی خردمندست
چگوئیم کز شب چند رفت یا چندست	بجز زجملہ کہ آزاد مرد ایں بندست

ظہوری کہتا ہے کہ عشق میں جو شخص دیوانگی کی قابلیت رکھتا ہے اُسی کو خردمند سمجھنا چاہیے بس چاہیے کہ تو سب سے قطع تعلق کر دے، کیونکہ جو شخص تعلقات سے آزاد ہے وہی بندِ عشق کا مرد (یعنی اسکے لائق) ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ جبکہ میری صبح تاریکی کے سبب شام سے مشابہ ہے تو مجھسے ؟ کیا پوچھتے ہو کہ رات کتنی گذری یا کتنی باقی ہے؟ مطلب یہ کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک میرے دن اور رات پر تاریکی ہی تاریکی چھائی رہتی ہے، پس مجھے کیا خبر ہے کہ کتنی رات گذری اور کتنی باقی ہے؟ ظہوری کے شعر میں اسکے سوا کچھ جدت نہیں ہے کہ اُسنے اپنی عادت کے موافق اسمیں بھی صنعتِ تضاد کا التزام کیا ہے (یعنی دیوانگی پر خردمندی کا اطلاق کیا ہے اور آزاد پر مقید کا) مرزا نے ایک معمولی خیال میں جدت پیدا کی ہے اور نہایت صفائی سے مطلب ادا کیا ہے۔

غالب	ظہوری
نگاہِ مہر بہ دل سر نداده چشمۂ نوش	بشکر دیدۂ تر - تر زبانئے دارم
ہنوز عیش باندازۂ شکر خندست	کہ زہر گریہ طراوت دہِ شکر خندست

ظہوری کہتا ہے کہ میں دیدۂ تر کے شکر میں تر زبان اور رطب اللسان ہوں، کیونکہ گریہ کا زہر

معشوق کے شکر خند کو طراوت دیتا ہے (یعنی ہمارے رونے پر اُسکو بے اختیار ہنسی آتی ہے) گویا ہمارے آنسو خندۂ معشوق کی جڑ کو تر و تازہ رکھتے ہیں۔ مرزا کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق گو بظاہر ہمسے ہنسی خوشی کے ساتھ ملتا ہے مگر کوئی دلی محبت کی بات اب تک ظہور میں نہیں آئی جس سے ہمارا دل باغ باغ ہو جائے۔ اِس مطلب کو اِس طرح ادا کیا ہے کہ ابھی تک اُسکی نگاہِ مہر و محبت نے لذت و حلاوت کی سوت ہمارے دل میں جاری نہیں کی، بلکہ ہم صرف اُسکے ظاہری شکر خند پر فریفتہ ہو رہے ہیں۔

ظہوری کے ہاں وہی لفظی مناسبتیں جیسے دیدۂ تر اور تر زبانی یا زہر گریہ اور شکر خند بہ نسبت مرزا کے زیادہ ہیں مگر مرزا کا شعر اُس سے زیادہ بلیغ بہ نیچرل اور عاشقانہ ہے۔

غالب	ظہوری
نہ گفتہٗ کہ بہ تلخی لب از نوید پذیر	مگر کہ رخصتِ بے طاقتی شود مرہم
برو کہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پندست	کہ گوشِ دل شدگاں ریش گشتۂ پندست

ظہوری کہتا ہے کہ دل شدگاں (یعنی ہم عاشقوں) کے کان ناصح کی نصیحتوں سے زخمی ہو گئے ہیں، اُن کے اِس زخم کا مرہم یہی ہو سکتا ہے کہ اُنکو بے طاقتی (یعنی بے حوصلگی اور عدم تحمل) کی اجازت دی جائے، تاکہ وہ ناصح سے گلخپ ہو کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔

مرزا ناصح سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے ناصح! تو نے یہی نہیں کہا؟ کہ تلخی (یعنی ہماری نصیحت) سے موافقت کر لے، اور ہمارا کہنا مان لے۔ جا! اپنا رستہ لے، ہماری شراب اِس نصیحت سے زیادہ تلخ ہے، پس ہمکو تیری نصیحت کی تلخی سے آشتی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ قافیہ کیا

جیسا کہ ظاہر ہے۔ مرزا کے ہاں بہ نسبت ظہوری کے زیادہ گرم بندھا ہے۔

ظہوری | **غالب**

چہ غم کہ عہد گسل وارت کشاکشِ ناز
کہ ہر گسیختنی صد ہزار پیوند ست

درازدستیِ من چاکی ازفگند۔ چہ عیب؟
زپیش۔ دلقِ ورع با ہزار پیوند ست

ظہوری کہتا ہے کہ اگر ناز و غمزے کی کشاکش مجھسے عہد شکنی کراتی رہتی ہے تو کچھ افسوس کی بات نہیں، کیونکہ ہر گسیختنی (یعنی ہر عہد شکنی) لاکھ پیوند کا حکم رکھتی ہے۔ مطلب یہ کہ جس قدر تو عہد توڑتا ہے اسی قدر پیوندِ عشق زیادہ مستحکم ہوتا جاتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ اگر میری درازدستی اور بے باکی و رندمشربی نے دلقِ وَرَع و تقوےٰ کو کسی قدر پھاڑ ڈالا ہے تو میرا چنداں قصور نہیں ہے، کیونکہ اُسمیں تو پہلے ہی سے ہزاروں پیوند لگے چلے آتے ہیں، یعنی خود اہلِ ورع و تقویٰ ہی اُسکی دھجیاں اُڑا چکے ہیں، مگر ریاکاری سے پیوند لگا لگا کر اُسکا عیب ڈھانکتے رہتے ہیں۔ ظہوری کے شعر میں عشق و محبت کے ایک دقیق معاملے کی طرف اشارہ ہے۔ جو عشاق پر ہمیشہ گذرتا ہے۔ اور صنعتِ تضاد کا التزام بھی نہیں چھوڑا، کہ گسیختن پر اُسکے ضدِ حقیقی یعنی پیوند کا اطلاق کیا ہے۔ باوجودیکہ ظہوری کے ہاں یہ قافیہ نہایت عمدگی سے بندھا تھا۔ مرزا نے بھی اِس قافیے کے باندھنے میں کچھ کم دادِ بلاغت نہیں دی، یہاں تک کہ ظہوری کے شعر کو مشکل سے اُسپر ترجیح دیجاسکتی ہے۔

ظہوری | **غالب**

بگو حدیثِ وفا از تو باور ست بگو
شوم فداے دروغی کہ راست پنداست

زبیم آنکہ مبادا بمیرم از شادی
نہ گوید ارچہ بمرگِ من آرزومند ست

مرزا نے مانند کا قافیہ مطلع کے سوا پھر کسی شعر میں نہیں باندھا۔ اور ظہوری کے ہاں آرزومند کا قافیہ کہیں نہیں بندھا۔ اِس لئے یہ دو تو مختلف القوافی بیتیں ایک جگہ لکھدی گئی ہیں جیسی دونوں کے ظاہر ہیں۔ ظہوری کا شعر بہت صاف اور لطیف اور مرزا کے شعر سے زیادہ نیچرل ہے۔ مرزا نے مضمون میں جدت تو پیدا کی ہے مگر۔ یہ سُنکر کہ معشوق ہمارے مرنے کا آرزومند ہے خوشی سے مرجانا۔ واقع کے بالکل خلاف ہے۔

ظہوری | **غالب**

زاہلِ مہر و محبت نشاں نمی ارم کس
بہ مہرِ خویش و بہ بیمہری تو سوگند ست

وجود او ہمہ حسنست و ہستیم ہمہ عشق
بہ بختِ دشمن و اقبالِ دوست سوگند ست

ظہوری کا شعر صاف ہے۔ اوّل دعوے کرتا ہے کہ مہر و محبت کا دنیا میں کہیں وجود نہیں، اور اِس دعوے پر اپنی محبت اور معشوق کی بے مہری کی قسم کھاتا ہے جسکی خوبی اور لطافت ظاہر ہے۔ مرزا کا دعوےٰ یہ ہے کہ معشوق کا وجود سراپا حسن و جمال ہے، اور میری ہستی سراسر عشق و محبت ہے۔ اور اِس دعوے پر رقیب کے نصیب کی اور معشوق کے اقبال کی قسم کھاتا ہے جسمیں ظہوری کی قسم سے زیادہ لطافت اور نزاکت پائی جاتی ہے۔ رقیب کے نصیب کی قسم اسلئے کھائی ہے کہ جو وجود سراپا حسن و جمال ہے وہ بالکل اُسی کے حصّے میں آگیا ہے۔ اور معشوق کے اقبال کی قسم اِس لئے کھائی ہے کہ مجھ جیسا شخص اُسکے سودا میں عشق و محبت کا پتلا بنگیا ہے۔

اسکے سوا لفظی مناسبتیں جیسے حسن و عشق، وجود و ہستی، دشمن و دوست، اور بخت و اقبال یا تمام شعر کا متناسب اجزا میں تقسیم ہونا۔ اُنے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے۔

غالب	ظہوری
شمارِ کجروی دوست در نظر دارم	ز رہروانِ تو منزل شمار را کہ شمرد
دریں نوَرد ندانم کہ آسماں چندست	غم از کسے کہ ندانند ہش چندست

ظہوری کہتا ہے کہ تیری راہ میں جو شخص منزلیں گنتا ہے، اور یہ خیال رکھتا ہے کہ کتنا رستہ طے ہوا اور کتنا باقی ہے۔ اُسکو تیرے رہرووں میں کون شمار کرتا ہے؟ پھر کہتا ہے کہ "غم از کسی ست"، یعنی غم معشوق اُس شخص کا حصہ ہے جسکو اپنے غم کی کمی یا زیادتی کا مطلق شعور نہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ میرے خیال میں دوست کی کجروی کا تصور ایسا جما ہوا ہے کہ مجھے یہ خبر نہیں کہ اس نورد (یعنی کجروی) میں آسمان کی کس قدر شرکت ہے۔ مرزا کا بیان کسی قدر ظہوری کے بیان سے صاف ہے مگر مضمون کے لحاظ سے دونو شعروں میں کچھ لطافت یا خوبی معلوم نہیں ہوتی۔

غالب	ظہوری
برنج از پے راحت نگاہداشتہ اند	شود گسستہ بایام گرچہ زنجیر ست
ز حکمت است کہ پای شکستہ در بندست	اسیر آنکہ تبار نگاہ در بندست

ظہوری کہتا ہے کہ ایک مدت کے بعد لوہے کی بیڑی بھی کٹ جاتی ہے اور قیدی رہا ہو جاتا ہے؛ پس درحقیقت قیدی وہی ہے جو تار نگاہ معشوق میں اُلجھا ہوا ہے۔ جسکو اس قید سے کبھی رہائی نہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ ہیاں تکلیف میں اس لیئے رکھا جاتا ہے کہ راحت حاصل ہو۔ اور اسکی مثال یہ ہے کہ پای شکستہ آدمی کو جو چلنے پھرنے نہیں دیتے، اور جب تک ہڈی جڑ نہ جائے مقید رکھتے ہیں۔ اس سے مطلب یہی ہوتا ہے کہ آخر کار اُسکو راحت حاصل ہو۔ ظہوری کے شعر میں کسی قدر جدت ہے مگر شعر کی بندش سست اور ڈھیلی ہے مرزا کے ہاں مضمون میں کچھ ایسی جدت نہیں ہے مگر بیاں نہایت چست اور ٹھیک ٹھاک ہے۔

غالب	ظہوری
اگر نہ بہرِ من۔ از بہرِ خود عزیزم دار	ز بندگاں نسزد آرزو۔ خدا نکند
کہ بندہ۔ خوبیِ اُو خوبیِ خداوندست	ہمیں بس ست کہ ما بندہ او خداوندست

ظہوری کے شعر میں "خدا نکند" یا تو محض حشو ہے، اور یا اُسکے بعد کچھ عبارت مقدر ہے یعنی "خدا نکند کہ ما آرزو بکنیم" باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

مرزا کا شعر اُن کی غزل میں بیت الغزل ہے؛ اور معنیً اور لفظاً دونو طرح سے ظہوری کے شعر پر ترجیح رکھتا ہے۔

غالب	ظہوری
نہ آں بود کہ وفا خواہد از جہاں غالب	اسیرِ عشق۔ ظہوری نشانہ دارد
بدیں کہ پرسد و گویند ہست خرسندست	نشانہ اینکہ ببیداد دوست خرسندست

ظہوری کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اسیر عشق کی یہ پہچان ہے کہ وہ دوست کے ظلم سے خوش رہتا ہے۔ مرزا کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ میرا مقصود وفا کی تلاش سے یہ نہیں ہے کہ میں اہل دنیا سے وفا کا طالب ہوں؛ بلکہ میں اسی میں خوش ہوں کہ میں پوچھوں کہ دنیا میں وفا ہے؟ اور لوگ اُسکے جواب میں کہیں کہ ہاں ہے۔ دونو مقطع ہموار ہیں مگر باوجود اسکے مرزا کا بیان بانکپن سے خالی نہیں۔

ہمنے دونوشاعروں کی غزلوں کی شرح بخوبی کردی ہے ؛ مگر زیادہ نکتہ چینی کرنا غیر ضروری سمجھا ہے اور دونوغزلوں میں محاکمہ کرنا بھی ناظرین کی راے پر چھوڑ دیا ہے ۔ وہ خود بشرطیکہ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہونگے ۔ اس بات کا اندازہ کرلینگے کہ دونوغزلوں میں کیا نسبت ہے ۔

رباعیات

مرزا کی رباعیاں تعداد میں قریب سو ڈیڑھ سو کے ہیں جنمیں سے اکثر شوخی و بیباکی ، بادہ نوازی ، فخر و مباہات ، اور شکایت و زارنالی کے مضامین پر مشتمل ہیں ۔ اور کسی قدر متصوفانہ ، اور چند خاص خاص مضامین پر ہیں ۔ خمریات میں ظاہرا عمر خیام کا تتبع معلوم ہوتا ہے ۔ مرزا کی رباعی میں بنسبت عام غزلیات کے زیادہ صفائی و شگفتگی اور گرمی پائی جاتی ہے ۔ چنانچہ اُن میں سے کسی قدر رباعیاں بطور نمونے کے یہاں نقل کیجاتی ہیں ۔ اور جہاں ضرورت ہوگی رباعی کے ساتھ اُسکی شرح بھی کردیجائیگی ۔

۱ غالب بہ گہر ز دودۂ زاد شمم ــــ زاں رو بصفای دم تیغست دمم
چوں رفت سپہبدی - زدم چنگ بشعر ــــ شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

گہر و گوہر - اصل ۔ دودہ - نسل و خاندان ۔ زاد شم فشنگ کے باپ اور تور ابن فریدوں کے بیٹے کا نام ہے - جسکی نسل میں مرزا اپنے تئیں بتاتے ہیں ۔ دم تیغ - تلوار کی دھار ۔ دمم - یعنی میرا کلام سپہبدی - سلطنت و سپہ سالاری ۔ نیا - دادا ۔ نیاگاں جمع ۔ کہتا ہے کہ جب سپہبدی ہماری قوم سے رخصت ہوگئی تو میں نے شعر کہنا اختیار کرلیا ؛ گویا بزرگوں کا ٹوٹا ہوا تیر میرا قلم بنگیا ۔

۲ شرطست کہ بہرِ ضبطِ آداب و رسوم ــــ خیزد لعبد از نبی امامِ معصوم

زاجماع چہ گوئی بہ علی باز گراے ــــ مہ جاے نشین مہر باشد - نہ نجوم

یہ رباعی مرزا کے تفضیلی ہونے پر دلالت کرتی ہے نہ تشیع پر ؛ کیونکہ خلفاے ثلثہ پر نجوم کا اطلاق حضرات شیعہ نہیں کرسکتے ۔

۳ راہیست زعبد تا حضورِ اللہ ــــ خواہی تو دراز گیر و خواہی کوتاہ
این کوثر و طوبےٰ کہ نشانہا دارد ــــ سر چشمہ و سایہ ایست در نیمہ راہ

کہتا ہے کہ بندے سے خدا کی حضور تک ایک راہ ہے ؛ خواہ اُسکو دراز سمجھو خواہ کوتاہ سمجھو ۔ اور یہ جو کوثر و طوبے ہیں جنمیں اُسکی راہ کے کچھ کچھ نشاں پائے جاتے ہیں - یہ ایسے ہیں جیسے اثنار راہ میں چشمہ اور - سایہ آجاتا ہے ۔

۴ آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود ــــ از غصۂ فراغتش ہمانا نبود
دارد بجہاں خانہ و زن نیست درو ــــ نازم بخدا چیرا توانا نبود

تیسرے مصرع میں دارد کا فاعل خدا ہے جسکا نام چوتھے مصرع میں لیا ہے خانہ سے مراد خانۂ کعبہ ہے باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں ۔

۵ با دستِ غم - آں باد کہ حاصل ببرد ــــ آب رخِ ہوشمند و غافل ببرد
بگذاشتہ ام خمے ز صہبا بہ پسر ــــ کش اندہِ مرگِ پدر از دل ببرد

کہتا ہے کہ غم ایک ہوا ہے - ایسی ہوا کہ تمام خرمن کو اُڑا لیجائے ؛ اور دانا اور ناداں کی آبرو کو بہالے جائے ؛ اسی لئے میں بیٹے کے لئے ایک شراب کا مٹکا چھوڑ چلا ہوں ، تاکہ باپ کے مرنے کا غم اُسکے دل سے دھو دے ۔